سرور ادبی اکادمی جرمنی کے زیر اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ:1 (جولائی تا دسمبر 2003ء)

ایڈیٹر

حیدر قریشی

اعزازی مجلس ادارت:

نذر خلیق (پاکستان)۔۔ریحانہ احمد (کینیڈا)۔۔عمر کیرانوی (انڈیا)

سرورق: کیرانوی
قیمت: ۳۰ روپے
مطبع: فرید بکڈپو، دہلی

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے ایڈریسز

Nazar Khaleeq
Commercial Area,
Near Masjid-al-Rahman
Satellite town Khanpur,
Dist. Rahim Yaar Khan
Pakistan

Haider Qureshi
Rossertstr.6,
65795-Hattersheim,
Germany.

Umar Keranvi
L-21/b
Abul Fazal Enclave,
Okhla, Delhi-25,
India

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر اس ای میل ایڈریس پر بھجوائیں۔ شکریہ!

khaleeqkhanpur@yahoo.com اور hqg7860000@aol.com

rekhta

ناصر عباس نیر

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید نگاری

ڈاکٹر محمد علی صدیقی اُردو کے ممتاز نقاد ہیں۔ گذشتہ رُبع صدی سے ان کی آواز ترقی پسند حلقے میں مُعتبر اور محترم تو ہے ہی ”غیر ترقی پسند“ تنقیدی حلقوں میں بھی ان کے افکار کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے اور ان کی رائے کو اہم گردانا جاتا ہے۔

محمد علی صدیقی کی تنقید وسیع مطالعے اور گہرے تفکر کا ماحصل ہے۔ ان کے مطالعے کا تناظر سیاست، تاریخ، سماجیات اور لسانیات سے مرتب ہوا ہے۔ وہ ان علوم کی بنیادی بصیرتوں میں نہ صرف دستگاہ رکھتے ہیں بلکہ ان میں ہونے والی تازہ پیش رفت سے بھی برابر آگاہ رہے ہیں۔ انکا تنقیدی عمل دراصل ادب پارے کا پس منظری اور تناظری مطالعہ ہے اور یہ پس منظر اور تناظر مندرجہ صدر علوم (جو سائنس کی معروضیت کے حامل ہیں) اور ان کے امتزاج سے عبارت ہے۔ وہ ادب پارے کے سماجی مضمرات اور سیاسی مطالب کو بطور خاص اہمیت دیتے ہیں۔ زبان کے مطالعے میں بھی وہ سماجی ساختوں سیاسی فلسفوں کی دریافت پر زور دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا طرزِ فکر ترقی پسندی سے مستنیر ہوا ہے اور ترقی پسندانہ آئیڈیالوجی کسی سماجی مظہر کو خود مکتفی اور الگ تھلگ قرار نہیں دیتی۔ اس آئیڈیالوجی کی رُو سے سیاست، مذہب اور فنونِ لطیفہ کسی سماج کی بالائی ساخت (Super Structure) ہیں جو ایک بنیادی ساخت (Infra Structure) پر استوار ہے۔ انفراسٹرکچر معاشی سماجی ڈھانچہ ہے۔ اور دونوں ساختوں میں براہ راست رشتہ ہے، چنانچہ معاشی ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلی، سیاسی، مذہبی اور ادبی رویوں کو لازماً متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا سماج کی بالائی ساختوں کا مطالعہ تجزیہ بنیادی ساخت کو ملحوظ رکھے بغیر ممکن نہیں، مارکسی آئیڈیالوجی کے اس تصور کو قبول کرنے کی بنا پر تمام ترقی پسند ناقدین (بشمول محمد علی صدیقی) ادب کے پس منظری مطالعے پر زور دیتے ہیں۔

محمد علی صدیقی کی تنقید میں ایک مستحکم تاریخی شعور برابر کارفرما رہتا ہے۔ اس تاریخی شعور کا مرکزِ ثقل برصغیر سمیت تیسری دنیا کی معاشی، سیاسی، صنعتی، تعلیمی اور فکری صورتِ حال ہے، بلاشبہ یہ صورتِ حال ناگفتہ بہ ہے اور اس کا

باعث (ان کے نزدیک) وہ سرمایہ دارانہ سماجی نظام ہے، جس کی زد میں یہ ممالک براوراست یا بالواسطہ رہے ہیں اس تاریخی شعور میں کسی حد تک اوعائیت ہے۔ غالباً اس لیے کہ انہیں ہر جگہ اور ہر زمانے میں سامراجیت کے ہتھکنڈے یکساں نظر آتے ہیں، تاہم ان کا سماجی شعور تغیر کو لازم گردانتا ہے (تاریخی مادیت کے زیر اثر) وہ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ مسلسل مسائی نہ صرف صورتِ حال کو انجام کار بدل دیتی ہیں بلکہ یہ مسائی جس مقصد اور سمت کے جس شعور سے متحرک ہوتی ہیں، وہی تبدیلی کا رُخ بھی متعین کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی ارادہ کسی بھی صورتِ حال کو جنم دیتا یا ختم کرتا ہے اور اگر اب تک صورتِ حال نہیں بدلی تو اس نقطہ نظر کی رُو سے اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو انسانی جدوجہد کی رفتار کم ہے یا وسیع سماجی شرکت سے یہ جدوجہد محروم ہے یا پھر سمت و مقصد کا واضح شعور اس جدوجہد کی پشت پر نہیں ہے۔ محمد علی صدیقی کی تنقید عمومی ادبی و جمالیاتی اہداف سر کرنے کے بجائے زیادہ مقصد و سمت کے مخصوص شعور کی فروغ و اشاعت میں زیادہ سرگرم دکھائی دیتی ہے تاکہ صورتِ حال تبدیل ہو، جمالیاتی اہداف کو اپنے تنقیدی عمل کے سیدھے نشانے پر نہ رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ادب کی ادبیت کے ہی منکر ہیں۔ نہیں وہ اس کے قائل ہیں مگر ان کے ہاں ادبیت کا مفہوم مختلف قسم کا ہے۔ اور یہ مفہوم مارکسی تھیوری سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یعنی وہ جمالیاتی مسرت کو ادب کا بنیادی (اور آخری) وظیفہ قرار دینے کے بجائے اسے ادب کا محض ایک ثانوی، پہلو مانتے ہیں اور اسے ادب کی ایک ایسی قوت قرار دیتے ہیں جو سماجی مقاصد کے حصول میں معاون ہوتی ہے، اُن کے اپنے لفظوں میں:

''میرا تعلق ایک ایسے فکری میلان سے ہے جو زندگی کے بارے میں کسی منصوبہ بندی میں تو شریک نہیں ہے لیکن اچھی یا بُری تبدیلیوں کی سچی عکاسی کو فن گردانتا ہے، اس شعبہ کا ایک ذیلی کام یہ بھی ہے کہ عکاسی کی تنقیح اور اگر ضروری ہو تو اس پر تنقید کی جائے۔'' (مضامین، ص۔ 8)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ وہ فن کے الہامی اور اظہاری نظریات میں یقین نہیں رکھتے بلکہ ادب کو سماجی تبدیلیوں کا آئینہ سمجھتے ہیں، فن کا الہامی نظریہ فن کو موجود اور معلوم حقیقتوں کی ترجمانی تک محدود نہیں سمجھتا، بلکہ ناموجود اور نامعلوم سے اپنے رشتے میں بھی اعتقاد رکھتا ہے۔ اس نظریے کے حامل فنکار کا تخلیقی شعور سماجی سطح سے آگے کائناتی سطح کو بھی مس کرتا ہے، اور متعدد ایسے سروکاروں کو ہٹو کا دیتا ہے جو روزمرہ کی زندگی سے بظاہر غیر متعلق ہوتے ہیں۔ ترقی پسند اور دیگر اصلاحی ادب کے مویدان سروکاروں کو بورژوا ذہنی تعیش کا نام دیتے ہیں اور انہیں فنکار کی سماجی علیحدگی کا نتیجہ بھی ٹھہراتے ہیں۔ اگر ادب کو سماجی شعور اور سماجی شعور کو مادی حالات سے لازماً منتج کیا جائے گا تو فن کے الہامی اور اظہاری نظریات پر اس نوع کے اعتراضات لابدی ہیں۔

محمد علی صدیقی جب ادب کو سماجی تبدیلیوں کی عکاسی پر مامور کرتے ہیں تو فنکار پر یہ ذمہ داری بھی عائد کرتے ہیں کہ وہ سچی عکاسی کرے اور ادب کے ''ذیلی شعبے تنقید'' کو یہ فریضہ سونپتے ہیں کہ وہ عکاسی کے سچے یا باطل ہونے پر نظر

رکھے۔ گویا وہ تخلیق پر تنقید (جو سماجی اور تاریخی شعور سے بہرہ ور ہو) کو نگراں رکھنے اور اس سے تخلیق کی سمت نمائی کا کام لینے کے قائل ہیں۔ مارکسی نقاد عکاسی کے حقیقی یا باطل ہونے سے مراد بالعموم اس کا رجائی ہونا لیتے ہیں، ایک مارکسی کی نظر میں وہ ادب معاشرے کا سچا عکاس نہیں، جو مایوسی، بےزاری، تنہائی، افسردگی اور بے معنویت کے مضامین سے عبارت ہو۔ اُس کے نزدیک فنکار سماج کا ایک منفعل ترجمان نہیں بلکہ وہ سماجی تبدیلیوں کو مثبت اور ارتقائی رُخ دینے والی ذمہ دار اور فعال ہستی ہے۔ تاریخی مادیت ایک مارکسی کو یہ باور کراتی ہے کہ تاریخ کا عمل انسانی ارادے سے خالی نہیں۔ انسانی ارادے کی لاٹھی سے تاریخ کی جہت بدلی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مارکیست کی رُو سے اگر معاشرے میں بےزاری، افسردگی اور یاسیت پیدا کرنے والے حالات موجود بھی ہوں تو ان کی عکاسی، حقیقی نہیں ہوگی۔ حقیقی عکاسی وہ ہوگی جو ان حالات کے تجزیے کے بعد ان حالات کو بدلنے پر قادر ایک رجائی لائحہ عمل پر مبنی ہوگی۔ سوشلسٹ حقیقت نگاری نے یہی نقطہ نظر اختیار کیا تھا اور جب اس نقطہ نظر میں انہیں ایک بڑی سیاسی قوت کے پس پشت ہونے کی بنا پر ادعائیت پیدا ہوگئی تھی تو تمام اُدبا کیلئے یہ بات شاہی فرمان کا درجہ اختیار کر گئی تھی کہ وہ بہر طور رجائی زاویہ نظر اختیار کریں، یہیں مارکسیت میں تناقض بھی پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ تھیوری حقیقت نگاری کو اپنا بنیادی اصول قرار دیتی ہے اور دوسری طرف بہر طور رجائی زاویہ نظر اختیار کر کے حقیقی مادی حالات (جو بےزاری اور اجنبیت پیدا کرتے ہیں) کی عکاسی سے گریز بھی کرتی ہے، اور مشابہت پسندی کا شکار ہوتی ہے۔

محمد علی صدیقی کے ہاں نظریے کی بوجھل تکرار اور اُکتا دینے والی اشتہاریت نہیں، وہ مسائل کے تجزیے میں اور ان کے حل کے طور پر مارکسی تھیوری کو بروئے کار تولاتے ہیں۔ مگر اپنے تنقیدی عمل کو توازن اور اعتدال کا پابند بھی بناتے ہیں بنابریں انہوں نے سکہ بند ترقی پسند اُدبا کے ساتھ ساتھ جدیدیت پسندوں کے مطالعات بھی پیش کیے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنے حلقے کے تخلیق کاروں کی ستائش میں کہیں کہیں غلو سے کام لیتے ہیں (مثلاً فیض اور فراز کے سلسلے میں) تاہم وہ ترقی پسند کیمپ سے باہر کے فنکاروں کی تحسین فن میں اپنے نظریے کو مزاحم نہیں ہونے دیتے۔

غالب کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> شاید بڑے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اردگرد کے حالات کے بارے میں غافل اور ماورائے احساس وفوق الفطری سچائیوں میں گم ہوجاتا ہے" (مضامین، ص176)

بظاہر اس رائے میں غالب کی بڑائی پر طنز کیا گیا ہے۔ مگر رائے کو محمد علی صدیقی کی جملہ تنقیدات کے تناظر میں رکھ کر پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ماورائے احساس اور فوق الفطری سچائیوں، کو مانتے ہیں بلکہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سچائیاں بڑی شاعری کی تخلیق کا موجب بھی بنتی ہے۔ یوں وہ دیگر ترقی پسندوں کی مانند اس انتہا پسندانہ فکر کے حامل نہیں کہ واحد سچائی اردگرد کے مادی ومعاشی حالات ہیں۔ محمد علی صدیقی کی تحریروں میں اس

ایقان کا اظہار بار بار ہوا ہے کہ انسانیت کی سب سے بڑی قدر اور ضرورت علم ہے۔ اور علم جس تجسس کا ثمر ہے وہ مادہ اور ماورائے مادہ دونوں قسم کے حقائق کا تعاقب کرتا ہے۔ محمد علی صدیقی کی فکر میں توازن کا ایک اور سبب بھی ہے۔ ہمارے ہاں مارکسی فکر کے بیشتر مقلدوں نے مشرق کی روایت (جو مابعد الطبیعات پر استوار ہے) کو مسترد کیا ہے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے حقیقت کی اُس مادی تعبیر کی پیروی کی ہے، جسے مغرب کے آرتھوڈاکس مارکسی فلاسفہ نے پیش کیا ہے، جبکہ محمد علی صدیقی نے مشرق کی مذہبی اور صوفیانہ فکر سے اپنا ذہنی رشتہ برقرار رکھا ہے۔ اور اس طرح حقیقت کے ایک ہمہ گیر تصور کو مقبول کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مارکسی معتقدات کی قبولیت کے جوش میں اُس روایت سے منقطع نہیں ہوئے، جس پر ان کی ثقافتی شناخت کا انحصار ہے۔

محمد علی صدیقی ایک مستحکم تنقیدی موقف کے حامل تو ہیں مگر انہیں اپنے موقف کی حتمیت پر اصرار نہیں "نشانات" کے ابتدائیے میں رقمطراز ہیں:

"نشانات کے مضامین میں جاری وساری سچ کو لمحہ موجود کی صرف ایک تاویل قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ "سچ" کی ہزاروں تاویلیں، اپنے جلو میں بڑی گہما گہمی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان مضامین کا "سچ" ہی واحد سچ ہے" (ص 9)

اپنے سچ کو اضافی ماننا، اپنے سچ کے ضمن میں کسی تشکیک کی وجہ سے نہیں بلکہ اس عاجزی کی وجہ سے ہے جس کے بغیر کوئی علمی وفکری نصب العین حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی خالص علمی ضابطہ اخلاق ہے، اور اسی پر عمل پیرا ہو کر دوسرے مکاتب فکر کے ساتھ ڈسکورس جاری رکھا جا سکتا ہے۔ جو نظریہ واحد اور مطلق حقیقت کے طور پھر خود کو ہر طور منوانے کی راہ پر چلتا ہے، وہ علم وفکر کی ترقی میں سنگِ گراں ثابت ہوتا ہے، اس ضمن میں محمد علی صدیقی کے خیالات اہم ہیں:

"نئے ادب اور نئی تنقید کا اولیں مقصد جمہوری بلکہ حقیقی جمہوری معاشرہ کے قیام میں حتی المقدور معاونت ہونا چاہئیے" ("نشانات"۔ ص 17)

ظاہر ہے اگر تنقید کو جمہوری معاشرے کے قیام میں معاون ہونا ہے تو اسے ایک ہمہ جہت ڈسکورس، بننا ہوگا، اپنی حدود کو پھیلانا اور ہر مکتب فکر (ونقد) کی آواز اور رائے کو برابر مرتبہ اور احترام دینا ہوگا۔ نیز ادب کے ہمہ جہت مطالعے کیلئے ہر سمت سے اُس پر روشنی ڈالنا ہوگی تاکہ متن میں مضمر ہر نوع کے سروکاروں کو منظر عام پر لایا جا سکے۔ اس کیلئے ایک سے زائد تنقیدی نظریات اور حربوں کو آزمانے کی ضرورت ہوگی۔ (اور ایک جمہوری معاشرے میں ہی مختلف اور متعدد نظریات پنپ سکتے ہیں) یہ تنقیدی رویہ جس امتزاجیت اور عدم مطلقیت سے عبارت ہے، مابعد جدید تنقید ی میں اسے خصوصی اہمیت ملی ہے۔ ان دنوں مابعد جدیدیت اردو میں زیر بحث ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس نئے تنقیدی مبحث کا اردو میں آغاز محمد علی صدیقی نے 1976ء میں ساختیاتی لسانیات پر اپنے سلسلہ مضامین سے کیا تھا جو "اوراق" میں چھپے تھے۔ ان مضامین میں ساختیات کو ترقی پسندانہ زاویے سے جانچا گیا تھا،

چونکہ ساختیات اور ترقی پسند (کی آرتھوڈاکس تعبیر) میں کئی مقامات پر ٹکراؤ کی صورت موجود تھی، اس لیے محمد علی صدیقی نے اسے رَد کیا۔ ساختیاتی لسانیات پر اُن کے چند اہم اعتراضات یہ تھے:

1۔ ساختیات زبان کے غیر تاریخی/ایک زمانی (Synchronic) مطالعے کی موید ہے۔ یوں یہ "جمودی" نقطہ نظر کی حامی ہے۔

2۔ ساختیات ہمیں غیر ضروری طور پر وجود یاتی (Ontopojical) مباحث میں اُلجھاتی ہے۔ اس نے ایک ایسا مذہب تیار کیا ہے جو انہیں چیزوں کی شیئت میں اُلجھا کر خود چیزوں سے الگ تھلگ کر دیتا ہے۔

3۔ یہ سسٹم نظریہ تاریخ، جدلیت اور سائنسی پیش گوئی کے خیالات پر ضرب لگاتا ہے۔

ترقی پسندانہ فکر چونکہ ہر نظریے کو اس کے تاریخی پس منظر کے حوالے سے جانچتی ہے اور یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ ہر نظریہ لازماً سیاسی معانی اور مقاصد کا حامل ہوتا ہے، اس لیے محمد علی صدیقی ساختیات (اور مابعد جدیدیت) کو عالمی سیاسی نظام کا ایک ایسا حربہ خیال کرتے ہیں، جو پسماندہ اقوام کو بعض "غیر ضروری" مسائل میں اُلجھا کر ضروری اور بنیادی مسائل سے صرف نظر کرنا سکھاتا ہے۔ محمد علی صدیقی کے اس نقطہ نظر سے ان کی انسان دوستی مترشح ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ساختیات انہی معانی (اور مضمرات) میں محدود و محصور ہے جو محمد علی صدیقی نے بیان کیے ہیں، اصل یہ ہے کہ محمد علی صدیقی نے ساختیات کا مطالعہ مخصوص ذہنی پس منظر اور فکری تحفظات کے ساتھ کیا ہے۔ وہ عام طور پر کسی تنقیدی تھیوری کی کلاسیکی تعبیرات پر بھروسا کرتے ہیں، مغرب میں یہ تعبیرات مارکس اور اینگلز کی فکر کی بنیاد پر ٹرانسکی، کرسٹوفر کاڈویل اور جارج لوکاچ وغیرہ نے پیش کی ہیں۔ کلاسیکی مارکسیت اپنے تصورات کی حتمیت میں اعتقاد رکھتی ہے، اس لیے یہ ان تصورات پر نظر ثانی اور انہیں دیگر نظریات کے ساتھ ملا کر پڑھنے کی ضرورت سے بے نیاز ہے، مغرب میں اب کلاسیکی مارکسیت کی جگہ نو مارکسیت نے لے لی ہے۔ اور نو مارکسیت کا امتیاز ہی یہ ہے کہ اس نے خود کو دوسرے، معاصر نظریات کے تناظر میں رکھا اور اپنا جائزہ لیا ہے۔ اور معاصرہ نظریات میں ساختیات و پس ساختیات بھی شامل ہیں۔ تھیوڈور اڈورنو، بریخت، گولڈ مان، لوئی آلتھیوسے، پیئر ماشر ے، فریڈرک زجمی سن، میری الگیلٹن نو مارکسی نقاد اور فلسفی ہیں، کلاسیکی مارکسیت اور نو مارکسیت میں ایک اور بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر ادب کو سراسر سماجی معاشی حقیقت کا عکاس سمجھتی ہے۔ سُپر سٹر کچر اور اساس (Base) میں براہ راست رشتے کی قائل ہے، جبکہ نو مارکسیت ادب کی اضافی اور محدود خود مختاری کو تسلیم کرتی ہے، نیز ادبی متن کی آئیڈیالوجی اور متن میں مضمر آئیڈیالوجی میں فرق کرتی ہے بلکہ آئیڈیالوجی کو محدود سیاسی مفہوم میں مقید رکھنے کی بجائے اسے وسیع انسانی تجربے سے منسلک بھی کرتی ہے، مارکسیت کی یہ بُلند فکری سطح بلاشبہ ساختیات و پس ساختیات کی بصیرتوں سے اخذ و استفادے کا ثمر ہے۔ چونکہ ہمارہاں ان نظریات کو ترقی پسندوں نے رَد کیا اس لیے نہ تو خود مارکسیت کی تعبیر نو کر سکے نہ مغرب کے نو مارکسیوں سے استفادہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے

مارکسی نقاد آج بھی وہی باتیں دہرائے چلے جا رہے ہیں جو نصف صدی پیشتر کہی گئی تھیں اور جو آج کی دانشورانہ علمی فضا کیلئے یا تو اجنبی ہیں یا از کار رفتہ، بایں ہم محمد علی صدیقی کے نقطہ نظر کے سلسلے میں یہ دفاعی دلیل دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی فکری کاوشوں کو ایک ایسے سماج کی تعمیر میں صرف کرنا چاہتے ہیں جو سائنسی عقلیت پسندی کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی اور معاشی مساوات سے متصف ہو۔ ان کے نزدیک مذکورہ اوصاف سے محروم معاشرہ پیچیدہ علمی اور فلسفیانہ مباحث کی ''عیاشی'' کا متحمل نہیں ہوتا، تاہم محمد علی صدیقی اصولی طور پر خالص علم کی جستجو کو انسانیت کی اولین قدر تسلیم کرتے ہیں۔

ترقی پسندی کا اینٹی تھیسس، جدیدیت ہے، مغرب (بالخصوص جارج لوکاچ) اور اردو کے ترقی پسند ادبا جدیدیت کو زوال پسندی سے تعبیر کرتے ہیں اور مارکسیت کو ترقی پسندی کا نام دیتے ہیں۔ محمد علی صدیقی بھی جدیدیوں کی انفرادیت پرستی، تنہائی، داخلیت پسندی وغیرہ کو مورد طعن بناتے ہیں اور ان روشوں کو سماجی عمل سے گریز کا نام دیتے اور انہیں رجعت پسند استعماری عزائم کے حامل سیاسی فلسفے سے منسلک گردانتے ہیں، محمد علی صدیقی جب جدیدیت کی فکری کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں تو غالباً ان کا مقصد مارکسیت کے نظریاتی امتیاز کو اجاگر کرنا ہے اور جب وہ جدیدیت پسندوں کو مارکسیت کے مقابلہ میں (تفصیلی مطالعے کیلئے راقم کا مقالہ ''مارکسی تنقید کے متن دوز'' مکالمہ (کراچی) کے شمارہ نمبر ۹ میں ملاحظہ کیجئے) ہدفِ تنقید بناتے ہیں تو ان کے پیش نظر بعض جدیدیوں کی انتہا پسندانہ روشیں ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''دوسری طاقت کچھ ایسے لایعنیوں اور نراجیوں کی منفی آوازوں سے عبارت رہی ہے۔ جو جدیدیت کے نام پر ہماری قومی اور بین الاقوامی زندگی کے درمیان ارتباط ختم کرنے کے علاوہ قومی وجود کو ہلاکت و فلاکت کے سپرد کرنا چاہتے ہیں وہ اس طرح کے ان لوگوں کے ہاں ہیئت کے حق میں متشدد عصبیت کے علاوہ خود شاعری اور زندگی کے خلاف اس قدر غلو آمیز تعصبات ہیں کہ جب ہم ان حضرات کی تحریروں میں ادب کی خود مختاری، تخلیقی عمل کی سائنس بیزاری اور فرد کی تنہائی جیسے مسائل کو سب سے محکم داعیوں کے روپ میں دیکھتے ہیں تو پھر صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ادب اور زندگی کو سبوتاژ کرنے کیلئے اس کے علاوہ اور کیا ہتھیار ہو سکتے ہیں۔ (''نشانات''۔ ص 84)

اہم بات یہ ہے کہ محمد علی صدیقی اُس جدیدیت کے مخالف نہیں ہیں جو عقلیت اور سائنسی ترقی کی موید ہے، وہ برملا کہتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ جدید ہونے کا دعویٰ صرف وہی ادیب کر سکتا ہے جو سائنسی انکشافات اور تقاضوں پر برہم ہونے کی بجائے ان سے کھلے دل و دماغ کے ساتھ معاملت کرے''۔ (''نشانات''۔ ص 86)

قصہ یہ ہے کہ جدیدیت کی دو صورتیں نمایاں اور قابل امتیاز ہیں۔ ماڈرنٹی اور ماڈرنزم۔ ماڈرنٹی کا تعلق تمام علوم اور فکری منطقوں میں ظاہر ہونے والی جدید روشنی سے ہے اور ماڈرنزم ادب و فن کے جدید رویوں سے متعلق ہے،

لہٰذا ایک کو جدیدیت اور دوسری کو جمالیاتی جدیدیت سے موسوم کیا جا سکتا ہے اردو میں سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک مزاجاً ماڈرنٹی کی حامل تھیں۔ اسی لیے ان کا سروکار محض ادب اور فلسفہ جمال نہیں تھا۔ محمد علی صدیقی بھی جس جدیدیت کی تائید پر مائل نظر آتے ہیں وہ ماڈرنٹی ہے اور اس تائید کی وجہ اپنے خطے کی پسماندگی کا شعور ہے۔ اس شعور کو محمد علی صدیقی کی تنقیدی فکر کا مرکزہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جب وہ جدیدیت پسندوں کے ادب میں اجنبیت، تنہائی اور بے زاری کے موضوعات پر چوٹ کرتے ہیں تو ان کا استدلال ہے کہ ہمارے ہاں ابھی وہ سائنسی و صنعتی سماج محض ایک خواب ہے، جس میں تعلیم، صحت، روزگار کے مسائل نہیں ہوتے۔ فرد معاشی بے فکری اور جسمانی عیش پسندی سے اُکتا کر اپنے اندر ایک بے زاری محسوس کرتا ہے۔ اس صورت میں اب ادب میں تنہائی اور معاشرتی گریز کے موضوعات کو پیش کرنا، ان کے نزدیک ایک محض فیشن اور اپنی مٹی سے عدم انصاف کے برابر ہے نیز ایک حقیقی صورت حال کے جواب میں غیر حقیقی ردِ عمل ہے۔ محمد علی صدیقی کی اس رائے میں یقیناً وزن ہے۔ اور اس میں ادب کو حقیقی زندگی سے وابستہ رہنے، ادب کو زندگی کی بدلنے والی قوت اور تہذیبی شناخت کا ذریعہ بنانے پر زور بجا طور پر موجود ہے۔ اور تہذیبی شناخت کی استواری ماضی کے ارتقا پذیر شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ اکثر ترقی پسندوں نے ماضی کو زیادہ تر جاگیردارانہ نظام کے مساوی سمجھ کر رد ہی نہیں کیا اس کی تضحیک بھی کی ہے مگر محمد علی صدیقی کے ہاں یہ انتہا پسندی نہیں ہے اور وہ ماضی کا ایک وسیع تصور رکھتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر ہے کہ حال کی معنویت ماضی کے صحت منداجزا کی فعال شرکت کی مرہون ہے اور اس صحت منداجزا کی زندگی اس میں ہے کہ وہ تخلیقی مقبولیت کا مظاہرہ کریں۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ماضی کے جس شعور کے حامل ہیں اس میں وہ روایت بھی شامل ہے، جو فکری تسلسل رکھنے کی وجہ سے کسی قوم کی ثقافتی شناخت کو ممکن بناتی ہے۔

محمد علی صدیقی معروضی سماجی و سیاسی صورت حال کے تجزیے میں گہری بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں گو ان تجزیوں میں کہیں کہیں صحافیانہ عنصر در آتا ہے، مگر مجموعی طور پر یہ تجزیے گہرے انفرادی تفکر اور تاریخی شعور کے مظہر ہوتے ہیں اپنے خطے کی سماجی و سیاسی صورت حال پر مرتکز رہنے کی وجہ سے وہ تخلیقی تجربے کی ماہیت کے غائر تجزیے پر متوجہ ہو سکے ہیں نہ ادبی متن کی ساخت میں مضمر مختلف النوع سروکاروں کی نشاندہی پر مائل ہو سکے ہیں۔ ویسے وہ جس تنقیدی موقف کے علمبردار ہیں اگر اس کی حدود کو ملحوظ رکھیں تو اس قسم کے مطالبات اصولاً درست نہیں ہیں۔ ہر تخلیق کار اور نقاد کو اس کی تخلیقی و فکری حدود میں ہی زیرِ بحث لانا مناسب ہوتا ہے۔ بہرکیف محمد علی صدیقی ایک ایسے نقاد ہیں جن کا فکری تناظر قومی و عالمی مسائل، تاریخی و تہذیبی معاملات اور جدید سائنسی علمی و لسانی اکتشافات کو محیط ہے جن کے تجزیاتی طریق میں معروضیت، توازن اور جرات مندی بیک وقت موجود ہیں اور جن کا استنباطی عمل بالعموم زندگی کی کلیت کو ملحوظ رکھنے سے عبارت ہوتا ہے۔ اس حوالے سے وہ احتشام حسین اور ممتاز حسین کے بعد اہم ترقی پسند نقاد تو ہیں ہی، اردو کے بھی ممتاز نقاد ہیں۔